انتظار حسین: ہجرت سے قبل

شہرین جہاں انصاری، ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

ملخص

انتظار حسین ایک تخلیقی فن کار ہیں۔ کہانی پن ان کی فطرت کا حصہ ہے۔ انتظار حسین نے فکشن کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے ناول اور ناولٹ لکھے، افسانے اور فن ڈرامہ نگاری میں اپنے قلم کا جوہر دکھایا۔ ان افسانوی تحریروں میں افسانہ نگاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں دنیاوی نیرنگیوں، اس کے نشیب وفراز اور مسائل ومصائب کی بہت زندہ، پرکشش اور ہمدردانہ تصویریں بیان کی ہیں۔ انتظار حسین نے اپنی ان تحریروں کے ذریعہ اپنے بچپن کو زندہ رکھا اور نہ صرف یہ کہ ان تحریروں میں انتظار حسین کے بچپن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں بلکہ ان تحریروں میں ہمیں ہندوستانی گاؤں دیہات کی مشترکہ تہذیب بھی صاف طور سے نظر آتی ہے، گاؤں میں مشہور بعض لوک کہانیوں کو انتظار حسین زندگی بھر نہ بھول پائے مثلاً زمین کے اندر پاتال ہے وہاں سانپوں کا راجہ رہتا ہے جس کا نام راجہ باسٹھ ہے یا پھر یہ کہ زمین کے اندر بالشتے رہتے ہیں اور اگر کانی انگلی سے بالشت بھر گہری زمین کھودی جائے تو یہ عجیب وغریب مخلوق باہر نکل آئے گی، سننے میں یہ سب محض بچوں کو ڈرانے کے لیے کہی گئی باتیں لگتی ہیں مگر انتظار حسین نے ایسی باتوں کو زندگی بھر اپنے ساتھ رکھا اور اپنی تحریروں میں اسے جگہ دی۔

انتظار حسین: ہجرت سے قبل

جدید دور کے وہ مصنفین جو اردو زبان کو صرف ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب مانتے ہیں۔ان میں انتظار حسین کا نام اہم ہے۔انتظار حسین اپنے اسلوب کے اعتبار سے نئے اور انوٹھے ہیں۔ان کے افسانے،افسانچے،کہانیاں،ناول اور ناولٹ ایک بار سے زیادہ پڑھنے کے مستحق ہیں۔

انتظار حسین کے مطابق سب سے بڑا تخلیق کار خدا ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا وہ غائب رہتا ہے اسی طرح تخلیق کار جتنا اہم ہوتا جاتا ہے اس کے غائب ہونے کی چاہ بھی بڑھتی جاتی ہے۔اس لیے یہی بہتر ہے کہ تخلیق کار مشہور ہونے کے بجائے اپنی تخلیق پر اپنا دھیان مرکوز کرے۔تخلیق کار نظر نہیں آتا صرف محسوس ہوتا ہے اس کی تخلیق نظر آتی ہے۔

انتظار حسین کی پیدائش ڈبائی میں ہوئی مگر وہاں انھوں نے چند سال ہی گزارے،اس کے بعد ان کا خاندان ہاپوڑ میں جا بسا اور انتظار حسین بھی ڈبائی کی یادوں کو سینے میں بسائے ہاپوڑ چلے گئے،مگر ڈبائی جو اس وقت ایک معمولی سا گاؤں تھا ان کے دل سے کبھی نکلا نہیں،انتظار حسین کا خاصہ بھی یہی ہے کہ وہ ماضی کی یادوں کو کرید کرید کر باہر نکالتے ہیں اور اپنی تحریروں میں ناسٹلجیائی فضا تعمیر کرتے ہیں،انتظار حسین نے اپنی تحریروں میں ڈبائی کا کئی مرتبہ ذکر کیا ہے،ان تحریروں میں ہمیں انتظار حسین کا بچپن نظر آتا ہے ،ڈبائی میں رہتے ہوئے انھیں مختلف کھیلوں مثلاً پتنگ بازی اور گلی ڈنڈے جیسے کھیلوں میں دلچسپی ہوئی،وہ ڈبائی کی گلیوں میں کسی بے خوف پرندے کی مانند منڈلاتے۔جنگلوں میں جا کر آم،املی،جامن،بیر وغیرہ پھلوں کا ذائقہ لیتے اور دوستوں کے ساتھ بے پرا وہ ہو کر خوب دھما چوکڑی مچاتے،انتظار حسین نے اپنی ان تحریروں کے ذریعہ اپنے بچپن کو زندہ رکھا اور نہ صرف یہ کہ ان تحریروں میں انتظار حسین کے بچپن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں بلکہ ان تحریروں میں ہمیں ہندوستان گاؤں دیہات کی مشترکہ تہذیب بھی صاف طور سے نظر آتی ہے،گاؤں میں مشہور بعض لوک کہانیوں کو انتظار حسین زندگی بھر نہ بھول پائے مثلاً زمین کے اندر پاتال ہے وہاں سانپوں کا راجہ رہتا ہے جس کا نام راجہ باسٹھ ہے یا پھر کہ زمین کے اندر بالشتے رہتے

ہیں اور اگر کانی انگلی سے بالشت بھر گہری زمین کھودی جائے تو یہ عجیب وغریب مخلوق باہر نکل آئے گی، سننے میں یہ سب محض بچوں کو ڈرانے کے لیے کہی گئی باتیں لگتی ہیں مگر انتظار حسین نے ایسی باتوں کو زندگی بھر اپنے ساتھ رکھا اور اپنی تحریروں میں اسے جگہ دی انتظار حسین کی خودنوشت ''جستجو کیا ہے'' میں ڈبائی کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے، اسی کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد کاظم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''انتظار حسین نے اپنے بچپن کا حال جن الفاظ میں بیان کیا ہے ان میں صرف بچپن نہیں بلکہ اس وقت کا ڈبائی یعنی ہندوستان موجود ہے۔اس گاؤں میں ہندوستان کے تمام طبقات اور پیشے سے متعلق لوگ جمع ہیں اور اب تک انتظار حسین کو وہ سب یاد ہے یعنی مردان کبابی، رنگریز، ان کے پڑوسی فقر چند کی دکان مٹھن لال حلوائی کی دکان اور اس کی گجیا، گاؤں کا مندر، ان کے گھر کے قریب کی مسجد، اکہ کی سواری، کربلا، شہنشاہ حسین وغیرہ، ڈبائی کی مشترکہ تہذیب، کھلے ذہن کے لوگوں کے ساتھ ساتھ کھلا کھلا آسمان اور واسیع وعریض گھر اور اس کا دالان اور آنگن، محلّہ بٹا ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے قربت اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہنے اور ایک دوسرے کے گھر کے ساتھ ساتھ دلوں میں گھر کئے رہنے کی روایت، اس کے برخلاف آج گھر تو وہی ہے لیکن وہ سمٹا ہوا نہ صرف محسوس ہوتا ہے بلکہ دکھائی بھی دے رہا ہے، پہلے کشادگی نہ صرف سڑکوں اور گلیوں میں تھی بلکہ ذہن میں بھی ہوتی تھی لیکن اب دونوں ہی سطحوں پر ختم ہو چکی ہیں۔''

(ہماری آواز، جلد۱۴ شمارہ۱۲(۲۰۱۷) ص۔۶۵۔۶۶)

انتظار حسین کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا، ان کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن وہ ہر صورت میں اپنی جڑوں سے جڑے رہے، تقسیم کے سبب پاکستان کوچ کرنے کے بعد بھی ان کے دل سے اپنے وطن کی یادیں بھلائی نہ جا سکی، اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ انتظار حسین ڈبائی میں پیدا ہوئے بچپن کی چند ساعتیں ڈبائی میں گزرانے کے بعد ان کا خاندان ہاپوڑ منتقل ہو گیا اور یہیں ہاپوڑ میں ہی ان کا داخلہ اسکول میں ہوا، انتظار حسین کے اسکول تک پہنچنے کا سفر بھی دلچسپ ہے، اصل میں انتظار

حسین کے والد نے اپنے ذوق مطالعہ سے اسلامی معلومات حاصل کیں اور بقول انتظار حسین ''مولویوں سے بڑھ کر مولوی بن گئے'' اسی زمانے میں انجمن تحفظ ماثر متبرکہ نام کی ایک انجمن قائم ہوئی، انجمن کے قیام کی ضرورت یوں پیش آئی کہ سلطان ابن سعود نے جنت البقیع بنی ہوئی پختہ مزاروں کو برابر کرنے کا کام شروع کیا۔اس میں بہت سے شیعہ علماء کی مزاریں تھیں، یہ بات دنیا بھر کے شیعہ مسلمانوں کو ناگوار گزریں ، ہندوستان کے شیعہ مسلمانوں نے بھی اس سلسلے میں انجمن تحفظ ماثر متبرکہ نامی انجمن قائم کی، انتظار حسین کے والد ماجد صاحب اس انجمن کا حصہ رہے اسی انجمن کی طرف سے انھوں نے مختلف شہروں کے دورے کیے، مختلف جگہوں پر قیام کیا۔ وہاں کے لوگوں سے ملنے اور انجمن کے مقصد کے تحت مسلمانوں کو اکٹھا کر کے احتجاج جلوس منعقد کراتے ،اسی سلسلے سے انھوں نے چند دن لکھنؤ میں بھی قیام کیا ان دنوں لکھنؤ اسلامی تعلیم کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور عربی اور فارسی تعلیم کا گہوارہ تھا لکھنؤ میں جگہ جگہ دینی مدارس قائم تھے ۔انجمن کے دورے کے حوالے سے انتظار حسین کے والد نے وہاں کے مختلف مدرسوں کا دورہ کیا اور ان سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، واپس آ کر انھوں نے انتظار حسین کو ایسے ہی کسی مدرسے میں بھیجنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس کی ابتداء انھوں نے گھر میں ہی شروع کر دی، ابھی جب انتظار حسین ا، ب، ج لکھنا سیکھ رہے تھے انھیں عربی کی ''الصرف'' نامی کتاب تھما دی گئی، مولوی منظر علی صاحب فرزند کو ایک عالمِ دین مجتہد کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے اسی شوق میں انھوں نے انتظار حسین کو گھر پر ہی عربی تعلیم دینی شروع کر دی ۔ابھی انھوں نے بغدادی قاعدہ ہی ختم کیا تھا کہ انھیں فتح اور ضَرب کی گردانیں حفظ کرانی شروع کر دیں ،انتظار حسین کے مطابق والد صاحب اس وقت یہ سمجھتے تھے کہ ان گردانوں کے حفظ ہو جانے کے بعد قرآن کی آیات کے معنی سمجھ میں آنے لگیں گے۔

پھر انتظار حسین کو اسکول بھیجنے کا مرحلہ شروع ہوا، والد مولوی منظر علی اسکول کی تعلیم کے سخت خلاف تھے وہ انتظار حسین کو مدرستہ الواعظین میں داخل کرانا چاہتے تھے، انھیں اسکول کی تعلیم پر زرا بھی اعتبار نہ تھا اور نہ ہی اسکول میں پڑھتے ہوئے بچوں پر بھروسہ کرتے تھے انتظار حسین کو جب آگے پڑھنے کی بات اٹھی تو ان کا فیصلہ دوٹوک تھا ان کے مطابق اسکولی تعلیم اور اسکولی لڑکوں کی صحبت انتظار حسین کو خراب کر دے گی۔ دوسری طرف انتظار حسین کے والد عصری تعلیم اور انگریزی تعلیم کی اہمیت کو بھی سمجھتے تھے اس لیے ان کے والد نے اول تو یہ انتظام کیا کہ انھیں گھر پر ہی تمام طرح کی تعلیم دی جائے لہٰذا گھر پر ہی انتظار

حسین کی انگریزی تعلیم کا انتظام ہوا اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ان مضامین کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا گیا جو میٹرک تک کے درجوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ مولوی منظر علی صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ ان تمام مضامین کو انتظار حسین گھر پر ہی پڑھیں اور میٹرک کے امتحان میں بیٹھیں اور مٹرک پاس کرنے کے بعد انھیں مدرسہ الواعظین میں داخل کر دیا جائے گا، مگر ان کا یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ہوا یوں کہ خاندان کے دوسرے افراد کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو انھوں نے احتجاج کیا۔ والد ماجد کے اس فیصلے کی مخالفت کرنے والوں میں انتظار حسین کی بڑی بہن سب سے پیش پیش تھیں، انھوں نے بڑی جرات اور بے باکی سے والد مولوی منظر علی سے کہا کہ ''خاندان میں ایک مولوی بہت ہے۔ ہمیں دوسرے مولوی کی ضرورت نہیں'' انتظار حسین کے والد کی یہ سب سے بڑی بیٹی تھیں اور وہ انھیں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اپنی عزیز بیٹی کو اس طرح آمادہ بغاوت دیکھ کر چپ ہو گئے اور صبر اختیار کیا، صرف اتنا کہا کہ اگر اسکول میں داخلہ کرانا ہی ہے تو نویں جماعت میں کرانا کیونکہ انتظار حسین کو اتنا پڑھایا اور سکھا دیا گیا ہے کہ وہ بآسانی میٹرک کا امتحان پاس کر سکتے ہیں۔

یوں انتظار حسین کی اسکولی زندگی کا سفر شروع ہوا، ہاپوڑ میں ان کا داخلہ کمرشل اینڈ انڈسٹیریل ہائی اسکول میں ہوا۔ انتظار حسین کے گھر والوں کی خواہش تھی کہ ان کا داخلہ نویں جماعت میں ہو مگر اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ان کو آٹھویں جماعت میں شامل کیا۔ گھر والوں نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا ورنہ سرکاری اسکول والوں نے تو سرے سے بیچ کی جماعتوں میں داخلہ لینے سے انکار کر دیا تھا، کمرشل اینڈ انڈسٹیریل ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر انتظار حسین کے دادا کے شناسائیوں میں سے تھے۔ انھوں نے انتظار حسین کا ٹیسٹ لیا اور پایا کہ انھیں آٹھویں جماعت میں داخل کیا جا سکتا ہے، یہاں سے انتظار حسین نے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی۔

انتظار حسین کی اسکولی زندگی بس ان ہی تین سالوں پر محیط ہے یعنی آٹھویں نویں اور دسویں جماعت تک اس کے بعد مزید تعلیم کی غرض سے میرٹھ کالج میں داخلہ لیا میرٹھ شہر ہندوستان کا ایک تاریخی شہر ہے اس شہر سے بڑے بڑے نامور ادیب اور فن کار تو وابستہ رہے ہی ہیں مگر ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بھی اسے خاص اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے یہی وہ شہر ہے جہاں سے ۱۸۵۷ کی بغاوت کی روشنی پھوٹی تھی میرٹھ کی زمین میں بیشتر مجاہدوں کی قبرین آج بھی ہمیں ہندوستان کی تاریخ میں جنگِ آزادی کے

حوالے سے اس شہر کی برتری کا اعلان کرتی ہیں شہر میرٹھ کے متعلق ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون ''انتظار حسین اور میرٹھ'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''سبز پنکھیا کی تلاش اور انتظار میں سرگرداں ایک نوجوان ڈبائی سے ہاپوڑ اور ہاپوڑ سے شہر انقلاب میرٹھ کی سرزمین سے آملتا ہے۔ شہر انقلاب ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی- ہندوستان کی انگریزی جبر واستعداد سے نجات دلنے کے لیے پہلی بڑی منظّم کاوش ۱۸۵۷ء کی یادگار سرزمین میرٹھ۔ ہاں یہ وہی میرٹھ ہے جس کی مٹی کے ذرے ذرے میں وطن محبت کا نشہ ہے۔ یہاں کی مٹی میں ان ۸۵/ سپاہیوں کی محنت کا لہو شامل ہے جنہوں نے کارتوس چلانے سے منع کر دیا تھا اور متحد ہو کر انقلاب کو ہوا دی تھی۔ یہاں کی فضا میں پہلی جنگ آزادی کے نعرے تیرتے ہیں ۔صدر بازار کے طوائفوں کے ہاتھوں میں بجنے والی چوڑیوں اور للکار کی آواز کا سرور ہے جس نے سپاہیوں کے سر چڑھ کر انقلاب کی زمین تیار کی۔ میرٹھ کی اسی سرزمین پر شاہ پیر مزار پر قیدیوں کی کٹنے والی زنجیروں کی آواز اب تک گونجتی ہے ۔میرٹھ کی مٹی، پانی اور فضا میں آلود حب وطن کے جذبے اور کچھ کر گزرنے کے حوصلوں کو وہی کشید کر پایا ہے جس نے اس سرزمین سے والہانہ پیار کیا ہے۔ انتظار حسین ایسا ہی نوجوان تھا۔ اٹھارہ بیس برس کے نوجوان کے دماغ میں سبز پنکھیا کی تلاش اور دیوانگی کو میرٹھ نے لبیک کہا۔ انتظار حسین نے میرٹھ میں اپنی فطری تلاش وجستجو کو نوجوانی کے حسین خوابوں کا رنگ عطا کیا۔''

(ہماری آواز، جلد۱۴ شمارہ۱۲(۲۰۱۷) ص۔۳۳۔۳۴)

ان دنوں میرٹھ کا وہ علاقہ جہاں انتظار حسین کا کالج تھا انگریز فوجوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا انتظار حسین جب میرٹھ پہنچے تو اپنے رشتے کے ایک چچا کے گھر قیام کیا اور اپنے چچازاد بھائی انیس الرحمٰن کے ساتھ جب کالج دیکھنے گئے تو وہاں کا ماحول دیکھ کر سخت مبہوط ہوئے۔ اسکول میں تو فوراً ہی سب سے جان پہچان ہوگئی تھی مگر یہاں کالج کا ماحول بالکل اجنبی تھا اور اجنبیت سے پر تھا، یہاں ساتھ میں پڑھنے والے بھی ایک دوسرے کو نہیں پہنچانتے تھے، ایک ساتھ کلاس ہو رہی ہیں مگر کوئی کسی کو نہیں پہچان رہا، کسی کو

کسی سے غرض نہیں کہ کلاس میں کون داخل ہوا اور باہر کون نکل گیا، وہاں کا کلاس روم بھی ایک نہیں تھا، ہر مضمون کے لیے الگ کلاس میں جانا پڑتا تھا، اسکول میں تو ایک ہی کلاس میں پڑھائی ہوتی تھی وہاں کی درودیوار سے بھی انسیت ہو جاتی تھی مگر یہاں ویسا ماحول بالکل نہ تھا، یہاں پہنچ کر انتظار حسین کو سخت اجنبیت کا احساس ہوا اور اپنے پرانے اسکول کی یاد آئی، انتظار حسین نے اس کالج سے ایف اے، بی اے اور ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی اس لیے اتنے سالوں میں اجنبیت کا احساس زائل ہونا لازمی تھا، ایک مقام پر انتظار حسین اپنی اس کالج کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''خیر جس طالب علم کو الف اے، بی اے، ایم اے سب مراحل ایک ہی کالج میں طے کرتے ہوں وہ کتنے دنوں تک اجنبی بنا رہ سکتا ہے۔ سو اجنبیت تو رفتہ رفتہ جاتی رہی مگر استادوں سے قرب۔ طلباء جب قطار اندر قطار ہوں اور کلاس روم طلباء سے لبریز نظر آئے تو پھر چند ایک ہی طالب علم اپنے ہنر کے زور پر استاد سے قرب حاصل کر پاتے ہیں مگر ان کا یہ ہنر کسی کلاس فیلو لڑکی سے قرب حاصل کرنے میں کبھی کام نہ آیا۔ ہماری انگلش لٹریچر والی کلاس میں فرسٹ ایئر سے فورتھ ایئر تک تین لڑکیاں تھیں۔ دو ہندو، ایک مسلمان لیکن وہ اتنی الگ تھلگ رہتی تھیں کہ لڑکوں کے قریب بیٹھنے سے بھی گریز تھیں۔ پروفیسر صاحب کے قریب انہوں نے اپنا ایک گوشہ بنا لیا تھا۔ لیکچر یکسوئی سے سننا۔ کیا مجال کہ لڑکوں کی صفوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ لیں۔ ہمارے ایک سکھ کلاس فیلو نے جرات دکھائی تھی اور کلاس روم سے نکلتے ہوئے ایک لڑکی سے کلام کرنے کی کوشش کی تھی مگر منہ کی کھائی۔'' (جستجو کیا ہے، انتظار حسین، ص۔ ۶۵۔ ۶۶)

میرٹھ کالج سے انتظار حسین نے ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی، وہاں سے انھوں نے ۱۹۴۲ء میں ایف اے، ۱۹۴۴ میں بی اے اور ۱۹۴۷ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، میرٹھ کالج میں آنے کے بعد ہی انتظار حسین نے اردو میں اپنی دلچسپی دکھانی شروع کر دی۔ یہاں آ کر انھوں نے مختلف قسم کی اردو کتابوں کے مطالعے میں خود کو مصروف کر لیا جن میں ''ماورا (میراجی)''، ''نقش فریادی (فیض احمد فیض)'' اور علامہ اقبال اور ن۔ م راشد کے مجموعہ کلام شامل تھے اپنے طالب علمی زمانے میں انھوں نے رتن ناتھ سر

شار کی کتاب ''فسانہ آزاد'' بھی پڑھی اور غلام عباس اور کرشن چندر وغیرہ کے افسانوں کو بھی پڑھا، اس طرح سے میرٹھ میں طالب علمی کے زمانے میں ہی دھیرے دھیرے اردو زبان وادب ان کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ وہاں کے ماحول میں رہ کر وہ پوری طرح اردو زبان وادب میں متحرک ہو گئے، میرٹھ میں زمانۂ طالب علمی میں انتظار حسین صوبائی سطح پر ہونے والے تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے، میرٹھ کالج میں ان کے استاد پروفیسر جھا تقریری مقابلہ کرانے کے انچارج تھے، وہ انتظار حسین کو بہت عزیز رکھتے تھے ،انتظار حسین بھی تقریری مقابلوں میں شرکت کرتے اور اپنے استاد کی امیدوں پر کھرے اترتے ،تقریری صلاحیت کے ساتھ ساتھ میرٹھ کالج میں رہتے ہوئے انتظار حسین کی تحریری صلاحیتیں بھی پروان چڑھ رہی تھیں، پروفیسر مظہری کالج میگزین کے انچارج تھے اور انتظار حسین کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کے معتبر بھی تھے،انھوں نے انتظار حسین کو کالج میگزین کا ایڈیٹر منتخب کیا، میرٹھ کالج میں رہتے ہوئے انتظار حسین کے کئی قریبی دوست بنے ،جن میں بعض دوستوں نے آگے چل کر انتظار حسین ہی کی طرح اردو زبان وادب کی خدمت میں گراں قدر کارہائے نمایا انجام دیے،ان دوستوں میں سلیم احمد،حلیق احمد نظامی،جمیل جالبی ، عاصم سبزواری اور شفیق احمد وغیرہ شامل ہیں اور اساتذہ میں پروفیسر مظہری، پروفیسر شریف، پروفیسر جھا ، پروفیسر جیلانی اور پروفیسر کرار حسین وغیرہ کا ذکر انتظار حسین نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے، پروفیسر کرار حسین سے تو انھیں خاصی انسیت تھی اور پروفیسر کرار حسین بھی خاندانی قرابت داری کی وجہ سے انتظار حسین کو بہت مانتے تھے۔

پروفیسر کرار حسین کی صحبت سے انتظار حسین کو بہت فائدہ پہنچا انتظار حسین نے بھی اپنے مشفق استاد کا ساتھ نہ چھوڑا،اس زمانے میں حالات بھی ایسے بنے کہ انتظار حسین کو پروفیسر کرار حسین کی صحبت سے فیض یابی کا خوب موقع ملا، ہوا یوں کہ میرٹھ کالج سے گریجویشن مکمل کرنے کے بعد انتظار حسین کو ملازمت کی فکر ہوئی ،مختلف جگہ درخواستیں بھیجی پر کہیں سے مثبت جواب نہ ملا،اس کام میں ان کے بڑے بہنوئی شمشاد حسین نے بھی ان کا ساتھ دیا وہ اخبار میں پڑھ کر بتاتے کے کہاں کہاں اور کس محکمہ میں نوکریاں نکلی ہیں،خود مضمون بنا کر درخواست ٹائپ کر کے ضروری کاغذات منسلک کرتے اور انتظار حسین سے درخوست پر دستخط کروا کر قرآن کی آیات کا دم لگا کر اسے ارسال کرتے ،اس کے علاوہ وہ انتظار حسین کو مختلف مقابلہ جاتی امتحان میں بیٹھنے پر بھی اکساتے مگر اس وقت انتظار حسین کو اردو کا چسکا لگ چکا تھا وہ

جان بوجھ کراس طرح کے امتحان میں بیٹھنے سے کتراتے مگر ایم اے اردو میں کرنے کی خواہش ان میں موجود تھی ،ان کے کئی ایسے سینئیر بھی تھے جو نوکری کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے،ان لوگوں کو دیکھ کر انتظار حسین کے دل میں یہ شوق مزید پراون چڑھنے لگا، بڑے بہنوئی صاحب کی کوششوں سے ملازمت بھی مل گئی، وہ جنگ کا زمانہ تھا،کھانے پینے کی چیزوں کا قحط پڑا ہوا تھا اس لیے سرکار نے راشننگ کا محکمہ قائم کیا اور عوام کو راشن کارڈ پر اناج اور غلہ دیا جانے لگا، ہر علاقے میں اس کا ایک دفتر ہوتا تھا، انتظار حسین اسی راشننگ کے محکمہ میں انسپکٹر مقرر ہو گئے دن کو وہاں پر کام کرتے اور شام کو اپنے استاد پروفیسر کرار کے گھر پر تعلیم حاصل کرتے ،اسی دوران میرٹھ یونیورسٹی میں آگرہ یونیورسٹی کی طرز پر شعبۂ فارسی سے الگ ہٹ کر شعبۂ اردو کا قیام ہوا اور پروفیسر کرار حسین جو پہلے انگریزی استاد تھے اب شعبۂ اردو کے صدرِ شعبۂ ہو گئے ،اردو کی کلاسز شام کو ان کے گھر پر ہوتی تھیں اس سے طلبا کو بھی آسانی ہوئی اور پروفیسر کرار حسین کو بھی۔ انتظار حسین ایم اے میں داخلے کے بعد پروفیسر کرار حسین کے گھر پر اپنی آگے کی تعلیم کے لیے کمر بستہ ہو گئے ، پروفیسر کرار حسین کے گھر تمام طرح کے مکتب فکر کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا،یہیں انتظار حسین مختلف طرح کی فکر رکھنے والے لوگوں سے سامنا ہوا، اپنے استاد کے گھر کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''استاد کا ڈیرا بھی خوب تھا۔ ہر قماش کی مخلوق، ہر رنگ کا پنچھی یہاں آکر گرتا تھا اور اپنے رنگ سے چہچہاتا تھا۔ کوئی لیگی، کوئی نیشنلسٹ مسلمان، کوئی سوشلزم کی بولی بول رہا ہے اور انقلاب کی خبر دے رہا ہے۔ کوئی اسلام کے احیاء کا مژدہ سنا رہا ہے۔ کوئی یہ سوچ کر متوحش ہے کہ پاکستان اگر واقعی بن گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا بنے گا۔ ادھر کوئی دوسرا اس تصویر میں مگن ہے کہ بٹ کے رہے گا ہندوستان ، لے کے رہیں گے پاکستان ۔ اور کرار صاحب کتنے سکون سے کہنے والے کی بات سنتے ۔ بس جیسے اس کے استدلال سے قائل ہو گئے ہیں مگر پھر اپنی بات شروع کرتے ۔ اب وہ غریب حق دق کہ انہوں نے تو میرے سارے استدلال کو الٹ دیا۔''
>
> (جستجو کیا ہے، انتظار حسین، ص۔۷۳)

انتظار حسین کے بچپن کے ایک بہت قریبی دوست ریوتی سرن شرما ان دنوں دہلی میں نوکری

کر رہے تھے انھوں نے انتظار حسین کو ن۔م راشد، میراجی اور فیض احمد فیض کے مجموعے بھیجے تب جا کر انھیں اصل میں نئی شاعری کے متعلق علم ہوا، انتظار حسین خود کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں اقبال کی شاعری کو ہی نئی شاعری سمجھتا تھا، یہیں سے انتظار حسین کے اندر جدید شاعری کو سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا، انتظار حسین نے ان شاعروں سے متاثر ہو کر خود بھی شاعری شروع کر دی مگر اسے کسی ادبی رسائل میں چھپنے کے لیے بھیجنے کی ہمت نہ جٹا سکے۔ لہٰذا ان تحریروں کو ''الامین'' میں بھیجا، اس وقت ''الامین'' ادبی رسالوں میں کم ادبی سمجھا جاتا تھا، انتظار حسین کی یہ تحریریں اس میں شائع ہوئیں، اسی رسالے میں پروفیسر کرار کی تحریریں بھی چھپتی۔ انتظار حسین نے اس رسالے کا پابندی سے مطالعہ شروع کر دیا اور ایک دن اسی رسالے میں حسن عسکری کا مضمون چھپا ہوا دیکھا تو بڑے خوش ہوئے کہ اب اس رسالے کا معیار بھی بلند ہو گیا، پروفیسر کرار اس وقت تک حسن عسکری سے ناواقف تھے، انتظار حسین نے ہی انھیں بتایا کہ حسن عسکری نئے ادب کے بہت اچھے نقاد ہیں، انتظار حسین حسن عسکری اور اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''عسکری صاحب سے میری ملاقات ایسے ہوئی جیسے پاؤں کے نیچے بیڑ آ جائے ۔قصہ یہ تھا کہ ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا میرٹھ میں، اس میں بہت سے شاعر آئے ہوئے تھے ہندوستان بھر کے۔ اس میں ایک شخص فراق گورکھپوری بھی تھے مجھے اس شخص کو دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ مشاعرے میں اسے دیکھ کر میری تسکین نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے ہم جماعتوں کو آمادہ کر لیا کہ اس شخص کو کالج بلانا چاہئے اور لیکچر سننا چاہئے۔ آرزو صرف اتنی تھی کہ انہیں قریب سے دیکھوں اور باتیں کروں ۔تو ہم بہت بھاگ دوڑ کر کے فراق صاحب کو لائے فراق صاحب نے اپنے لیکچر میں ایک صاحب کی طرف اشارہ کیا اور کہا محمد حسن عسکری یہ صاحب، جو فراق صاحب کے ساتھ تھے، ہم نے انہیں بالکل درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ وہ ہری سی اچکن پہنے ہوئے تھے گرم ہری سی اچکن اور مجھے عجیب سا لگا تھا کہ یہ کون شخص ہے جو فراق صاحب کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ جب جلسہ ختم ہوا تو ہم نے بڑے تعجب اور حیرت سے ان سے پوچھا کہ آپ محمد حسن عسکری ہیں؟ تو انہوں نے کہا ہاں میں محمد حسن عسکری ہوں۔ کیا ہو سکتا تھا؟ مجبوری تھی فراق صاحب تو ہمارے ہاتھ

سے نکل گئے ،عسکری صاحب ہمارے ہاتھ آ گئے اور پھر میرٹھ میں ایسا رشتہ قائم ہوا کہ بعد میں بھی قائم رہا۔''

(انتظار حسین ایک دبستان، ارتضیٰ کریم، ص۔۱۰۵، ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)

حسن عسکری کا خاندان چونکہ میرٹھ کا ہی تھا اس لیے میرٹھ شہر میں حسن عسکری آتے جاتے رہتے تھے، یہیں انتظار حسین کی ان سے ملاقات ہوئی اور باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ حسن عسکری بھی پروفیسر کرار حسین کے شاگرد رہ چکے ہیں اور انھوں نے انٹر میرٹھ کالج سے ہی کیا ہے۔ حسن عسکری بھی اپنے استاد سے ملنے کے خواہش مند تھے مگر تامل میں اس لیے تھے کیونکہ حسن عسکری نئے ادب کے تنقید نگار تھے اور پروفیسر کرار حسین حافظ، بیدل، رومی اور میرٹھ وغیرہ کے دلدادہ تھے وہ نئے ادب کو خاطر میں ہی نہ لاتے تھے، انتظار حسین نے جب پروفیسر کرار حسین سے حسن عسکری کا ذکر یوں کیا کہ وہ آپ ہی کے شاگرد ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں تو استاد نے بھی اپنے ہونہار شاگرد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اس طرح سے ان تینوں یعنی انتظار حسین حسن عسکری اور پروفیسر کرار حسین کی ملاقاتوں کا ایسا سلسلہ جاری ہوا کہ انتظار حسین خود فرماتے ہیں کہ ''اب سیر کی صورت یہ ٹھہری کہ عسکری صاحب گھر سے نکلے، مجھے میرے ٹھکانے سے اٹھایا اور چلے کرار صاحب کے ڈیرے کی طرف۔''

۳ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے قائد اعظم کی ایک تقریر نشر ہوئی جس میں منصوبۂ پاکستان کی تکمیل کے بابت بات کہی گئی تھی، اس تقریر کو سن کر مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ،مسلمانوں کے محلوں اور گلیوں میں پٹاخے چھوٹے، آتشبازیاں ہونے لگیں مگر جلد ہی ان کی یہ خوشی کافور ہو گئی جب انھیں حکومت کی طرف سے یہ پروانہ ملا کہ جلد فیصلہ کر کے بتاؤ کہ تمھیں پاکستان جانا ہے یا ہندوستان میں ہی رکنا ہے۔ لامحالہ جن لوگوں نے جلد بازی میں فیصلہ لیا وہ پاکستان جانے کو تیار ہو گئے ،میرٹھ کے بھی بیشتر مسلمانوں نے بھی پاکستان جانے کا فیصلہ کیا، دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے محلے خالی ہونے لگے، اسی دوران حکومت کی طرف سے پاکستان جانے کے لیے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئیں، انتظار حسین خود لکھتے ہیں کہ ان اسپیشل ٹرینوں کو دیکھ کر جن لوگوں نے ابھی کوچ کا ارادہ نہ بنایا تھا انھوں نے بھی اپنا بوریا بستر باندھ اور ٹھسا ٹھس بڑی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ دوسری طرف دہلی میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور اب یہ آگ اطراف کو اپنے حصار میں لینے کی در پے تھی، میرٹھ بھی اس کی زد میں آ گیا، انتظار

حسین پروفیسر کرار اور حسن عسکری کے بیچ حالاتِ حاضرہ کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی، حسن عسکری پاکستان جانے کے خواہش مند تھے جبکہ پروفیسر کرار اپنے ملک اور اپنی زمین سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے، انتظار حسین دونوں کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے، انھوں نے اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

ادھر عسکری کی ملازمت بھی کہیں مستقل نہیں ہوئی تھی، وہ دہلی سے چھوٹے تو میرٹھ آ گئے، میرٹھ کالج میں انھیں ملازمت یوں ملی کہ ایک استاد لمبی چھٹی پر گئے ہوئے تھے، حسن عسکری نے کچھ دن ان کی جگہ پڑھایا، مگر جلد ہی ان استاد کی چھٹی ختم ہوگئی اور حسن عسکری پھر بے روزگار ہو گئے، انھیں اعظم گڑھ کالج سے دعوت نامہ موصول ہوا لیکن چند دنوں میں ہی وہاں سے واپس آ گئے، اس سے پہلے وہ مکتبہ جدید سے منسلک تھے اب انھیں لے دے کر روزگار کی وہی ایک صورت نظر آئی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مکتبۂ جدید لاہور میں تھا اور لاہور پاکستان میں اس لیے انھوں نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا اور ایک دن پاکستان جانے والی اسپیشل ٹرین پکڑ لی اور پاکستان چلے گئے اور پھر ایک دن ریڈیو پر ان کے گھر والوں کو حسن عسکری کا ایک پیغام موصول ہوا ''میں یہیں رہونگا، تم لوگ بھی آ جاؤ، انتظار حسین سے کہو کہ تمہارے ساتھ وہ بھی آ جائے۔'' اس تعلق سے انتظار حسین مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''ادھر پاکستان جانے کا سان نہ گمان مگر عسکری صاحب کا پیغام۔ جیسے کسی نے خاموش حوض میں اینٹ پھینک دی۔ میں دبدا میں پڑ گیا۔ پھر سوچا کہ میں نقد دم تو نہیں ہوں۔ کوئی آگا پیچھا بھی تو ہے۔ گھر جاؤں، سوال ڈالوں۔ دیکھوں کیا جواب آتا ہے۔ سو ہاپوڑ کی راہ لی۔ والدہ تو اللہ میاں کی گائے۔ ان کی تو سمجھ ہی میں نہ آیا کہ ہاں کہیں یا ناں۔ والد صاحب اب دنیا کے معاملات سے یکسر بے تعلق ہو چکے تھے۔ اصل میں تو میرے بارے میں سارے فیصلے میری بڑی بہن نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، ان پر مستزاد ہمارے بہنوئی صاحب۔ مگر اس گھر میں ابھی تک نہ اپنے حوالے سے نہ اولاد کے حوالے سے پاکستان جانے نہ جانے کا سوال سرے سے زیر بحث آیا ہی تھا۔ اور ہاپوڑ شہر میں بھی پریشانی کے اثر آثار نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ سو ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ گرمجوشی سے رخصت کریں کہ پاکستان جگ جگ جاؤ۔ تمہیں امام ضامن کی ضامنی میں دیا

۔نہ یہ کہا کہ ہمیں چھوڑ کے کہاں کالے کوسوں جا رہے ہو۔اصل میں اس وقت تک پاکستان جانے کا مطلب یہ نہیں لیا جا رہا تھا کہ ہم اِدھر تم اُدھر۔یہ کہ جو پاکستان جائے گا اس کا پیچھے رہ جانے والے عزیز واقربا سے تانا ٹوٹ جائے گا اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کو ترس جائیں گے ۔مگر میں دبدا میں گھر گیا تھا۔دبدا میں گھر واپس آیا۔''

(جستجو کیا ہے،انتظار حسین،ص۔۸۸)

انتظار حسین نے اپنی ہجرت کے تعلق سے بس اتنا ہی کہا کہ ''اس چل چلاؤ میں بس میں بھی چل کھڑا ہوا۔'' یوں انتظار حسین نامانوس افراد کے بیچ نامعلوم شہر کی اور سفر کر گئے ۔انتظار حسین نے یوں اچانک ارادہ کیا اور پاکستان کی طرف ہجرت کر گئے لیکن اس ہجرت کو انتظار حسین کبھی بھول نہ سکے وہ آخری عمر تک اس ہجرت سے اٹھنے والی ٹیسوں کو محسوس کرتے رہے، بھلے انھوں نے اپنی جائے پیدائش کو بہت پہلے الوداع کہہ دیا تھا مگر بلند شہر کے اس معمولی سے قصبے ڈبائی کو وہ زندگی بھر نہ بھول پائے ،ایسا لگتا ہے کہ انتظار حسین نے ہجرت کرنے کے بعد اپنی ان پرانی یادوں کو پرت در پرت کھولنا شروع کر دیا اور ایک کے بعد ایک کر کے وہ ان یادوں میں الجھتے چلے گئے جن کا تعلق ان کے بچپن سے تھا۔

ہجرت کے حوالے سے انتظار حسین کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنے زخموں کو کریدتے رہتے ہیں جن پر وقت مرہم لگا دینا چاہتا ہو،ہجرت کا کرب انتظار حسین کی تحریروں میں شروع سے آخر تک دیکھنے کو ملتا ہے،لیکن یہ دیگر ہجرت کے موضوع پر لکھنے والے ادیبوں سے مختلف ہے،ہجرت کا کرب انتظار حسین کی تحریروں کی بنیاد ہے لیکن اس کا رنگ اور اثر مختلف ہے اور وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ اس میں اور زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی جن میں گنگا،جمنی تہذیب سے لے کر داستانوی عناصر کی شمولیت نے چار چاند لگائے اور انتظار حسین اپنی ان تحریروں کے سبب ادبی کہکشاں پر ایک روشن ستارہ بن کر چمکنے لگے۔

☆☆☆